ڈاکٹر محمد رؤف

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ گریجوایٹ کالج سمن آباد، فیصل آباد

ڈاکٹر عدنان احمد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف جھنگ، جھنگ

ڈاکٹر میمونہ ریاض

لیکچرار شعبہ اردو یونیورسٹی آف ایجوکیشن (فیصل آباد کیمپس)

نئی استعماریت اور معاصر میڈیائی ثقافت: ایک علمیاتی و ادبی تناظر

Neo-Colonialism and Contemporary Media Culture: Epistimological and Literary Perspective

Abstract:

Literal sociology discusses a society in the light of literary text and likewise the literary content in the perspective of social environment. Such research paradigm has been in vogue since Platonic times. Now a days, modern media is playing a vital role in knitting the socio-cultural texture of neo-imperialistic societies like ours.It is used for injecting shoping-addiction, promoting media consumerism and managing cultural trnformation for strengthening imperialistic penetration in neo-colonised nations but at the same time it assists to abolish the imperialistic exploitation of such neo-colonies and semi colonies also.Literary texts are the index of all such socio-political factors and hence, there is a dire need to study it so that we may properly judge the new environment and act accordingly. In this article, an attempt has been made to study the virtual world of ours in the light of some literary, co-literary and religious content.

Keywords:

Neo-Imperialism, Social medea, Literal Sociology, George Orwell, 1884, Aldus Huxley, Brave New World, Holy Quran, Taqwa, Virtual Society

دوسری جنگ عظیم کے بعد استعماری ممالک نے نئے زمانی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے مستعمرہ علاقوں کو موہوم سی آزادیوں سے شانت کر کے انھیں بالواسطہ طور پر اپنے حلقۂ اثر میں رکھنے کے لیے ماقبل کے

انتدابی بندوبست میں ترمیم و تنسیخ اور کتر بیونت کر کے جو متبال ضابطہ کار وضع کیا اسے نو استعماریت (Neo-Colonialism) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اب اس عہد کی ادبی نقد و نظر کا کلیدی داعیہ معاصر سماجی منظر نامے کی متنی تشکیلات پر مشتمل ایسے شعر و ادب کی تجزیہ کاری اور تعبیر تشریح ٹھہرا جو استعمار دوست اصلاحی منصوبوں سے ہم آہنگ ہوں یا جن سے ایسے استبدادی بندوبست کے بیانیوں کا کچا چٹھہ کھل کر قاری کے سامنے آ رہے۔ ایسے مشارات اقتصادی، سیاسی، لسانی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بالخصوص نشان زد کیے جا سکتے ہیں۔

جدید استعماری بساط پر ورچوئل اقدار و اعمال کی حد درجہ پزیرائی کے سبب ایک منقلب صورت حال متشکل ہو رہی ہے، لہٰذا اس عہد کے ادبی سرمائے میں میڈیائی ثقافت کے مروج آلات و وسائل کو نو استعمایت مرکوز کار فرمائی میں دیکھتے ہوئے ہمیں ایسی شعریاتی حکمتیں نشان زد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جن سے اس منقلب معاشرے کے "تازہ خداؤں" کی چیرہ دستیوں سے نہ صرف آگاہی میسر آئے بلکہ ان سے نبرد آزمائی کے سلسلے میں بھی کوئی صائب ضابطۂ عمل ترتیب دیا جا سکے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کی مابعد جدید دنیا میں الیکٹرانک اور سوشل میڈیا ایک کلیدی مواصلاتی ضرورت کے طور پر عالمی سماج میں اپنی جگہ بنا چکا ہے مگر اس ابلاغی نظامِ کار کو معاشرے کی غلبہ پسند مقتدر قوتوں نے اپنے انتدابی ہتھ کنڈوں کے لیے استعمال کر کے اس سے اپنی استعماری فعالیت کو بھی خوب بڑھایا ہے۔ بلاشبہ ایسے جدید میڈیائی آلات کی تشویق و ترویج کے قوائے محرکہ میں استعماری قوتوں کی صنعتی معیشت کو پیداواری کھپت کے لیے صارفی منڈیاں فراہم کرنے جیسا غالب عنصر بھی موجود ہے۔ ماضی قریب میں عالمی سطح پر دہشت گردی کا بڑھتا ہوا رجحان ہو یا پارسال میں پھوٹنے والی بین البراعظمی وبائی اُفتاد؛ ایسے بحرانوں کے دھندلے پس منظر میں جنگی ساز و سامان اور ابلاغِ عامہ سے متعلق میڈیائی آلات و وسائل سے متعلق صارفیت کلچر کی گرم بازاری ضرور نظر آئے گی۔ ایسی سفّاک استحصالی معیشت کے بے رحمانہ فروغ کی وجہ سے ہی نیو کلونیل ازم کو "the worst form of imperialism" کہا جاتا ہے جس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے Kwame Nkrumah لکھتے ہیں:

> "…those who practice it, it means power without responsibility and for those who suffer from it, it means exploitation without redress." (1)

لطف یہ ہے کہ دوسری طرف یہی مواصلاتی ذرائع مستعمرہ ممالک کے مظلوم طبقات کو سمتِ راہ سدھانے کے لیے قندیلِ راہبانی کا کام بھی دیتے رہے ہیں۔ لہٰذا نشر و اشاعت کے ایسے بنیادی ذریعے کا ادبی تخلیقات میں نوع بہ نوع حیثیتوں سے متنی تشکیلات میں در آنا ایک فطری امر ہے۔

فی زمانہ جدید میڈیائی معاملہ بندیاں اور سماجی فعالیتیں تازہ خون کی طرح ہماری نس نس میں سما گئی ہیں ،لہٰذا اس پر ڈسکورس کی تشکیل لمحۂ موجود کا ایک کلیدی اقتضا ہے۔ موجودہ دور کے شعرا واد با اپنی ادبی تخلیقات میں اسے نہایت اہم سروکار کے طور پر پیش کرتے آئے ہیں۔ ایسے ادبی سرمائے پر نقد و نظر کی صورت میں ہمارے اکابرین کا فکری میلان عموماً اس اجتماعی نکتے کی اور رہتا ہے کہ یہ آفتِ زمانہ یعنی سوشل میڈیا ہمارے ثقافتی تشخص کی بدھیا بٹھائے جاتا ہے۔ دفاعی حکمتِ عملی کی کم یابی بل کہ نایابی پر بھی متاسّفانہ اظہارِ خیال کیا جاتا ہے مگر بقدرِ اشکِ بلبل۔

امر واقعہ یہ ہے کہ قوموں کی نامیاتی نشوارتقا میں بیم ورجا کے مرحلے ہمیشہ سے درپیش رہے ہیں؛ پھر ورچوئل ورلڈ کی نئی کارگاہِ عمل میں ممکناتِ جسم وجاں کو سوشل میڈیا جیسی عیارِ تازہ سے ماپا جانے لگا تو اس پہ ہاہاکار کیسی؟۔ یہ ایک سنجیدہ سوال بنتا ہے ، کسی اعتراض کا آکھوا نہیں؛ مقصد مکالمے کا فروغ ہے؛ مناظرے کی تشویق کاری حاشا وکلّا۔ ایسے عمومی انتقاد میں محلِ نظر بات یہ رہتی ہے کہ موجودہ سائبر منظر نامے میں ہمارے زیادہ تر گیانی مسلم تہذیب وثقافت کے ہر مظہر کو معرضِ خطر میں پاتے اور حرفِ محرمانہ سے ہم آہنگ یہی نرسنگھیا بجائے جاتے ہیں کہ جو کچھ تہذیبی ثقافتی تشخص ہمارا تھا وہ رہا نہیں اور جو ہے اس کے بچ رہنے کوئی صورت سُجھائی نہیں دیتی۔ یہ تحفظات جزوی طور پر درست ہو سکتے ہیں،اور درست ہیں بھی، مگر کلّی طور پر قابلِ قبول نہیں۔ سوشل میڈیا کا فروغ ہمارے حواسِ خمسہ کے امکانی قویٰ میں نشوارتقا کی ایک منزل ہے۔ اس بات میں بھلا کیا برائی ہے کہ انسانی چشم وگوش کے لیے مژدۂ وصال اور نظارۂ جمال کے کچھ مزید امکانات روشن تر ہو چلے۔ حقیقتِ منتظر اپنے لباسِ مجاز میں نظر آنے کے لیے لبِ بام آموجود ہوئی۔

فلک نادرہ کار اقوام وملل کی باہمی نبرد آزمائی کے لیے فکر وعمل کی نوع بہ نوع قمار گاہیں سجاتا رہتا ہے اور مواصلات کے شعبے میں سوشل میڈیا کی حالیہ کارفرمائی بھی ایک دنیائے مواصلات کی ایسی ہی ایک بساطِ مسابقت ہے جو سیموئیل مورس کے ایک سادہ سے ٹیلی گراف کی ترسیل سے شروع ہو کر لمحۂ موجود کی گوگل، فیس بک اور یوٹیوب جیسی نہایت بسیط اور دقیق ویب سائیٹس کی صورت مسلسل اپنی کشادہ کاری کا ساماں کیے جاتی ہے۔ فی زمانہ اسی بساط پر مہرہ بازی کے جوہر دکھانے میں فلاح و اصلاح اور نشوارتقا کے حیات آفریں (Bioactive) مژدے سنائی دیتے ہیں اور قوموں کی امامت کے لیے مجوزہ تازہ نصابِ عشق کے مطابق ان اسباق کو پڑھنا بھی ضروری قرار پایا ہے۔ شاہدِ مقصود کے عشق میں محض خالی خولی آہ وفریاد محض خللِ دماغ ہے کیوں کہ 'وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں'۔ فی زمانہ اس ضمن میں سائبر کارگاہِ عمل کرجگ بنی جاتی ہے جہاں ہمیں ایسی مسابقتی

فعالیت دکھانی ہے کہ نتیجتاً اسباب و علل کی اس دنیا میں وصلِ لیلیٰ جیسے حسین اتفاق کے روشن ہو سکیں۔ غالب نے گنجینۂ معنی کے ایک طلسمِ ہوش افزا میں یہ پُر حکمت نکتہ موزوں کیا ہے:

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے(۲)

سوشل میڈیا کے ممکنہ خدشاتی نتائج کا خوف ہمیں امکانات سے مالا مال اس عہد کے تقاضوں کی تجزیہ کاری اور اخذ و استفادہ کی صائب منہج اختیار کرنے سے غافل کر دے تو یا قسمت، ورنہ ہمہ جہتی علمی پیداوار اور اس کی آسان تر تحصیل و ترسیل کے حالیہ دور میں انسانی شرف یابی کے فروغ کا ایسا ہی موقع ارزاں ہوا ہے کہ جس کی نظیر ماضی میں زبان کے سیکھنے یا تحریر کی ایجاد سے نصیب ہوا تھا۔ اس زرخیز کشتِ امکان سے خوشہ چینی کے لیے مگر شرط سلیقہ ہے اور فی زمانہ اقوامِ عالم کی باہمی مسابقت میں کامیابی کا پیمانہ بھی اسی سلیقہ شعاری کے اہتمام سے عبارت ہو گا۔ رزمِ حق و باطل یا تنازع للبقا کا یہ پانچواں دور چل رہا ہے؛ توقعات بھی فراواں اور خطرات بھی روز افزوں۔ مشرق کے حکیم الامت شاعر نے حقے کا لمبا سا کش لے کر رشید احمد صدیقی کی گرہ میں کیا موتی باندھا تھا! ''نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔''(۳)

فرہاد کی آزمائش اور تھی، منصور کی بپتا اور؛ مگر لمحۂ موجود میں کوہ کنی کی اڑچن رہی نہ ہی نخلِ دار کو بارآور کرنے کا فریضہ، یاروں کو محض 'سوم رس' کے کیف میں توازن بنائے رکھنا ہے اور بس؛ جو سنبھل چلے وہی سکندر۔ جارج آرویل کے اینٹی یوٹوپیائی ناول ''۱۹۸۴ء'' میں ایک ایسی جابر حاکمیت کی پیش بینی کا سراغ ملتا ہے جو قید و بند کے جیسے استحصالی حربوں سے انسانوں کے فکری قویٰ کو مقید کر کے ریاست کا انتدابی چلن رو بہ عمل لائے گی۔(۴) اقوامِ عالم میں سرمایہ دارانہ نظام کی بالادستی سے اس بات کی جزوی تصدیق بھی ہوئی۔ عالمی گاؤں میں ایک نیو ورلڈ آرڈر کی عمل داری کے خدوخال تک ابھرے مگر ۹/۱۱ کی صورت ایسے ریاستی استحصال کی ساخت شکن مستثنیات بھی برابر جلوے دکھاتی رہیں۔ آلڈس ہکسلے کے ایک اینٹی یوٹوپیائی ناول ''بریو نیو ورلڈ'' میں جس جبر فری ریاستی پالیسی (Suger-Coated Policy) کا تصور دیا گیا ہے، اہلِ نظر کے لیے محلِ غور ہے۔ اس ناول میں پیش کردہ ہائی بریڈ سماج میں ہر فرد بشر بنیادی انسانی حقوق کے نام پر ''مکمل آزادیاں'' انجوائے کرتا ہے۔ یہاں عوام کی یوں نفسیاتی تربیت کی جاتی ہے کہ وہ معلومات کی کثرت اور تفریح و تعیش کے آزادانہ ماحول کے کیف میں دھت ہو کر اپنے سمجھنے سوچنے کے جبلی شرف سے بھی رضاکارانہ طور پر دست برداری اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ ساری ساحرانہ صورتِ حال ابلاغی انجینئرنگ کے ذریعے پیدا کی جاتی ہے۔ مقتدر قوتیں جدید میڈیائی آلات کو استعمار

سازی کے لیے سب سے طاقت ور ہتھیار کے طور پر ایسی سلیقہ شعاری سے استعمال کرتی ہیں کہ مستعمرہ اقوام و ملل ان کی عملیاتی حرکیات کا بہ آسانی شکار بن جاتی ہیں۔اس ضمن میں نو استعماریت کے ایک مغربی دانش ور بجا طور پر لکھتے ہیں:

> "The essence of neo-colonialism is that the state which is subjected to it is in theory independent and has all the outward trappings of international sovereignity. In realityits economic system and thus its political policy is directed from outside."(5)

ہکسلے کے مذکورہ ناول میں ایک کیف آور دوا ''سوما'' کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو فرقۂ باطنیہ کے جنونی فدائیوں کو دی جانے والی حشیش کی طرح اثر دکھاتی اور اپنے ماتوں (Addecteds) کی فکری صلاحیتوں کی قلب ماہیت کر کے انھیں سازشی بیانیوں سے ہم آہنگ کرنے میں معاونت کرتی ہے۔اردو ناول ''فردوسِ بریں'' میں مذکور چھٹی صدی ہجری کے اس شاطر باطنی فرقے کا ایک کردار ''طورِ معنی'' اسی نوع کا نشہ (بھنگ) اپنے نووارد فداعی ''حسین'' کو پلا کر اسے اپنے منصوبہ بند تعقلاتی فریم ورک کا آلہ کار بناتا ہے:

> ''یکایک ایک خوب صورت نوعمر لڑکے نے آکے ایک شربت کا لبریز جام طورِ معنی کے ہاتھ میں دے دیا اور طورِ معنی نے اپنے ہاتھ سے حسین کی طرف بڑھا کے کہا ''اس جام کو پی اور ملکوت سے ایک درجہ اور قریب ہو جا''۔(۶)

کچھ ایسے ہی ''بریو نیو ورلڈ'' میں چھ صدیاں آئندہ کی تصوراتی دنیا پر مشتمل بڑے بڑے کنڈیشننگ سنٹروں اور انسانی ہیچریوں میں قائم فرٹیلائزنگ رومز میں کنڑولڈ اور منصوبہ بند (purpose-based) انسان نما جاندار تیار کیے جاتے ہیں جن کی فکری کنڈیشننگ ایسی ہی مسکرات (Soma) کی مدد سے ممکن بنائی جاتی ہے:

> "The service had begun.The dadicated soma tablets were placed in the centre of the table.The loving cup of strawberry ice-cream soma was passed from hand to hand and,with the formula"I drink to my annihilation,"twelve times quaffed"(7)

انسانی قوائے فکر و عمل پر تصرف دکھانے والی ایسی سحر کار چیز کو سنسکرت زبان کی منشیاتی اصطلاح کی رعایت سے ''سوم رس'' کی متبدل وضع کہہ لیجیے جو ہکسلے کی مذکورہ بالا ''سوما'' سے بھی تجنیسی علاقہ بنائے لگتی ہے ۔(۸) یوں بھی اس ناول کا اسمائی پیٹرن بالخصوص کرداروں کے رمزیہ نام ایسی مماثلت کی توثیق کرتے ہیں۔ایسے

جہانِ نو کی ریاستی حکمت عملی میں کارفرما سٹیٹ آپریٹس کے موثرات کا ذکر کرتے ہوئے دیویندر اسّر لکھتے ہیں کہ یہاں:

> ''انسان پہلے سے تیار کیے گئے منصوبوں اور منضبط سماج کی ضرورتوں کے مطابق تجربہ گاہوں میں تیار کیے جاتے ہیں۔ان کی تشکیل ان کے استعمال کے مطابق ہوتی ہے۔ماس میڈیا کے نئے نئے ذرائع، پوشیدہ محرکات، نئی نئی ڈرگز اور برین واشنگ کے ذریعے انسان کے ضمیر اور عقل کو ختم کر کے ایک ایسے سماج کی بنیاد ڈالی جارہی ہے جس میں ذاتی حیثیت جیسی کوئی چیز نہیں ہو گی۔''(۹)

غور کیا جائے تو موجودہ دور کی سائبر سپیس میں وہی ''سوما'' سوشل میڈیا کی عطا کردہ بے شمار منصوبہ بند معلوماتی سائٹس اور سمگل کردہ ایقانات شکن بیانیوں کی صورت انسانی عقل و شعور پر اپنے اثرات مرتب کر رہی ہے۔بساطِ خمار کے تازہ واردان کی شروعاتی خاطر مدارت اگر جلبِ منفعت سے بے نیاز رہ کر کی جاتی ہے تو ادھر میڈیا ماکیٹ میں بھی بلا دام کی ایم بیز، جی بیز، ایس ایم ایس آفرز، فون کالز اور بالا ہتمام صنفِ نازک کے ہاتھوں لوڈڈ سمّیں پیش کرنے جیسی متبسمی خدمات(Services with a smile)اور کیمرہ سکرین پر ان کے لچکتے کولہو، تھلکتے پستانوں اور مٹکتے نیناں کی توبہ شکن کشش عہدِ حاضر کے جوانانِ شوخ و شنگ کو اس فتنہ آخر زماں کی زلفِ گرہ گیر کا ویسا ہی اسیر کیے جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں سوشل میڈیائی ثقافت کی پزیرائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے استعماری اقوام نے اپنی وافر صنعتی مصنوعات کی تشویق انگیز تشہیر کاری سے قوم کے اجتماعی شعور کو خریداری کی لَت(Shoping Addiction)سے مدہوش بنائے رکھا ہے۔نوخیز اذہان میں ہاٹ چیٹ، بیلی ڈانس، گے کلچر اور سیکس ٹورزم جیسی اخلاق باختہ اقدار و روایات کو فروغ دیا جارہا ہے۔یہ ڈرامہ آگے کیا کیا سین دکھائے گا، ابھی کہنا قبل از وقت ہے کہ مذکورہ ''سوم رس'' رگ و پے میں نہیں اترا، ابھی فقط کام و دہن کی لذت یابی کا مرحلہ ہے۔ایسے میں یقیناً ہمیں ڈاکٹر تحسین فراقی کی چتاؤنی پہ کان دھرنا چاہیے:

> ''حکمت واقعی مومن کی گم شدہ میراث ہے مگر گم شدہ ورثے کے بھیس میں فکر کی چرس درآمد کرنا یقیناً قابلِ نفرین حرکت ہے۔''(۱۰)

یہاں سوشل میڈیا کی تنقیص ہر گز مقصود نہیں کہ یہ تو محض معلومات و افکار کے باسہولت لین دین کا وسیلہ ہے۔انسان کے پرکھوں کی محنتِ شاقہ سے یہ عظیم مکاشفاتی صلاحیت کی حامل ٹیکنالوجی دستیاب ہوئی ہے جس کی بدولت آج ہماری رسائی ان منطقوں تک ہو چلی ہے جو چند ہی برس قبل تک ہمارے مرغِ تخیل کی پہنچ میں

بھی نہ آتے تھے۔ آج ہم اپنے سائنسی اور تکنیکی دور کی تیز ترین فعالیتیں مثلاً آلاتِ حرب بشمول بائیولوجیکل وار فیئرز کی عمل داریاں، توپ و تفنگ کے دھانوں سے نکلتی آتشِ پرندہ، وسیع و بسیط فضاؤں میں جنگی جہازوں کی مڈھ بھیڑیں، آسمانی بجلی کا کوندتا جلال و جمال، تحت الارض مستور جغرافیائی تغیرات، سمندروں کی عمیق گپھاؤں میں چھپی آبی مخلوق اور ان کے معمولات؛ نیز اسی طرح آہستہ رو تفاعلات مثلاً نباتاتی نشوارتقا کے مراحل، رحمِ مادر میں متشکل ہوتے حیاتیاتی پیکر، اجرامِ فلکی کا حرکی میکانزم، عمیق سمندروں میں ڈکارتے بھنور کی آنکھ کے گرد شی جلال کا شروعاتی فریم ورک، حتیٰ کہ روئے جاناں کے دل کش خدوخال اور سیلِ سندرتا کے اترنے پر ریگِ صحرا کی طرح اس پہ چرمی سلوٹوں کے نزول جیسے نادر وقوعے تک کھانے کی میز پہ بیٹھے بیٹھے ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ میڈیکل سائنس میں میڈیائی آلات نے کائناتِ اصغر یعنی انسان کے درونے کی تمام فعالیتیں آئینہ کر دی ہیں اور ایسی تمام لطیف سرگرمیوں میں ماہرین کی مشّاق عمل داریوں کو محفوظ کر کے انھیں بڑے وسیع پیمانے پر تدریسی مقاصد کے لیے استعمال میں لانے کی راہ بھی ہموار ہو چکی ہے۔ الغرض یہ سائبر سپیس ہر طرح کے علوم و فنون کا ایک بحرِ زخّار ہے جس کا ''سوم رس'' حیات آفرین بھی ہے اور فناصفات بھی۔ تریاقِ مسموم بھی ہے اور زہرِ ہلاہل بھی۔ ظرف کے فرق سے تاثیر بدلے جاتی ہے۔ حکمت و عرفان کے یہ چھلکے ہوئے جام وسبو اہلِ ہمت کے لیے صلائے عام کا سامان ہیں۔

سوشل میڈیا کے ساتھ ہمارا ارتباط بہ حیثیت مجموعی ایک صارف کا سا رہا ہے۔ سنجیدہ علمی حلقوں نے اس نہایت قابلِ توجہ سماجی پیش منظر کے ضمن میں کوئی منصوبہ بند ضابطۂ عمل وضع کرنے میں خاصی بے نیازی کا ثبوت دیا ہے۔ بعض امور میں دیر سے بننے والی پالیساں محض احساسِ زیاں کا کرب دوبالا کرنے کے کام آتی ہیں۔ ایسے میں بہر حال ہمارا خودکار معاشرتی لائحہ عمل تین حصوں میں منقسم نظر آرہا ہے:

(۱) مزاحمتی رویہ

(۲) مفاہمتی رویہ

(۳) امتزاجی رویہ

یہاں پہلی قسم کا رویہ روایت کو جامد تصوراتی حصار میں مقید خیال کرنے والوں کا ہے جو ایسی کسی بھی پیش رفت کو اپنے اعتقادی نظام اور عملی زندگی کے لیے سوہانِ روح خیال کرتے اور کوچۂ جاناں میں نہ جانا ہی عافیت جانتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ رویہ ہمارے بعض مذہبی طبقات کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جیسا کہ غلام عباس کے افسانے ''دھنک'' میں ''سبز پوشوں'' کی حکومت بننے پر ان کی مجلسِ شوریٰ کی طرف سے ----- جس میں

''نیلی پوشوں''، ''پیلی پوشوں''، ''سرخ پوشوں'' اور ''سیاہ پوشوں'' کو بھی متناسب نمائندگی حاصل تھی----- -یہ نادر شاہی حکم جس کی رو سے:

''عہدِ حاضر کی تمام اختراعات و ایجادات مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈر، ٹیپ چینجر، کیمرے وغیرہ کی فروخت پر پابندی لگادی گئی۔''(۱۱)

واقیہ یہ ہے کہ جھوم کر اٹھتے دریاؤں کے سامنے بند باندھے سے امان میسر نہیں آتی۔ اگر بھنور تقدیر کا بہانہ ہو کر رقص کناں ہوا ہو تو اس کی گرہ کشائی کیوں کر ممکن ہو پائے گی۔ یہاں دیوندر ستیارتھی کے افسانے ''ستلج پھر بپھرا'' میں آئے تانیثی کردار ''نیر جا'' اور اس کے کلاس فیلو ''سکھی چند'' کی بے چارگے بھی یاد آنے لگتی ہے جن کی نظروں کے سامنے جنم بھوم کے گلی کوچے غرقاب ہو چلے:

''سکھی چند نے نیر جا کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا، نیر جا، نیر جا! طوفان تو آتے ہی رہیں گے ان پر کسی پیر کا حکم نہیں چل سکتا۔ دریاؤں کے طوفان، تہذیب و تمدن کے طوفان۔''(۱۲)

اس تناظر میں دیکھیں تو ہمیں ستلج کا یہ طوفان جسے پیر بابا کی دعائیں بھی روک نہیں پاتیں، ایک دوسرے طوفان یعنی ثقافتی یلغار کی تمثیلی صورت دکھائی دیتا ہے۔ دیکھنا مگر یہ ہے کہ آیا دریا بابا سے فرار اختیار کیے زیست کا بندھن قائم رہ پائے گا، حاشا وکلّا۔ کبھی تدبر کی توفیق ارزاں ہو تو ان احباب کے لیے یہ نکتہ بھی سبق آموز ہے کہ خیر القرون میں سوقِ عکاظ اور دیگر اسواق میں ہادیٔ عالم ﷺ کی مصالحانہ دلچسپی بل کہ دور کیوں جائیں ادھر ہندوستان میں اوّلین بزرگانِ دین نے میلوں ٹھیلوں میں اصلاحی مداخلت کر کے کشتِ اسلام کی آبیاری میں کیا کردار ادا کیا تھا؟ اسلامیوں کی اس غلبہ آور لطیف حکمتِ عملی کو ایک نوآبادیاتی مفکر برنارڈ ایس کوہن کے اس جملے میں بہ عکسِ جلی دیکھا جا سکتا ہے:

"The conquest of India was a conquest of knowledge."(13)

سوشل میڈیائی ردِّ عمل دینے والے دوسرے سماجی گروہ میں ایسے تمام افراد شامل ہیں جن کا تصورِ حیات ''اپی کیورین ماٹو'' سے مستنبط ہے اور وہ بغیر کسی زحمتِ فکر کے صارفیت کی لت (Shoping Addiction) میں پڑے اپنی قیمتی مہلتِ عمل اور وقیع جذبات واحساسات سمیت تن من دھن کے سبھی حاصلات داؤ پہ لگائے ورچوئل دنیا کی شہریت اختیار کیے بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے کا تیسرا طبقہ میانہ رو فکر و عمل کا حامل ہے۔ یہ گروہ اس منظر نامے سے متعلق کسی التباسی حقیقت کی زد میں آکر مفاہمت یا مزاحمت دکھانے کے بجائے سائنس دانوں کی سی نیوٹر یلیٹی یعنی عدم وابستگی کے ساتھ امکانات و خدشات کا تجزیاتی مطالعہ کر کے صائب ردّ

عمل کی منہج اختیار کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اس شدید عدم وابستگی میں ایک وابستگی کا پہلو البتہ ضرور ہوتا ہے اور وہ ہے انسانی فلاح و اصلاح کا پہلو۔ یہ حکمت عملی 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کے اصول پر قائم ہے اور ردّ و قبول کا یہ منہج انسان ساختہ فکر و فلسفہ کے بجائے الوہی تعلیمات کی سیادت میں اخذ کیا گیا ہے۔ یہ مابعد الطبعیاتی کو نیات میں رہتے ہوئے بشر مرکز کو نیات کی اختراعات و ایجادات سے ربط و تعلق استوار کرنے کی ایک احسن اطلاقی صورت ہے۔ دنیائے ''کن فیکون'' میں فکرِ سخن کرنے والوں پہ مضمونِ تازہ اور طبعی تدبّر کاروں پہ مکاشفات اور ایجاد و اختراع کا درِ امکان بند ہونے کا نہیں ہے۔

لہٰذا عناصر کے اس کھیل میں ترتیب و ترکیب کے بے شمار امکانات پوشیدہ ہیں جو کسی بھی زبان کی گرائمر (Langue) کے جیسے پس منظر میں رہتے ہوئے مضامینِ نوع بہ نوع کی صورت (parole) متشکل ہو کر کائناتِ ناتمام کی نشوو ارتقا کا سامان کرتے اور سمع و بصر کو نئے امکانات تک رسائی کا مژدہ سناتے ہیں۔ یہ جہانِ نو اپنی ماہیت کے اعتبار سے فطرت کا پروردہ اور نتیجتاً اسی کا ہم طبع بھی ہے مگر انسان کے ہاتھوں استعمال ہونے کی بنا پر اسے خیر و شر کے جیسے موضوعی انسلاکات بھی میسر آتے ہیں۔ آب و آتش کی مثل یہ نئی ایجادات انسانی فلاح و اصلاح کا ذریعہ بھی بن سکتی ہیں اور تسفیل و تخریب کا وسیلہ بھی۔ ہمیں ان ایجادات و اختراعات کے ساتھ ذمہ دارانہ آزادی کے ساتھ ربط ضبط استوار کرنے کا چیلنج درپیش ہے۔ فطرت میں موجود ہر ذی روح کسی غیر معمولی چیز سے معاملہ بندی میں قدرتِ کاملہ کے عطا کردہ جبلی شعور کو اپنا رہنما بناتا ہے۔ پرندہ کسی انجانی ترغیب آور شے کو چونچ سے جانچ کر اور بلی مشروب لبڑنے سے قبل اپنی مشامِ تیز سے پرکھ کر اسے استعمال میں لانے یا نظر انداز کرنے کا فیصلہ کرتی ہے جو فی نفسہٖ ایک تحقیقی قرینہ ہے۔ انسانی سماج میں ایسی پیش آمدہ صورتوں کے ضمن میں ہر قسم کے فکر و فلسفے سے ناوابستگی اختیار کرتے ہوئے فلاحی و اصلاحی اخذ و استفادہ کی سبیل ہی صائب طرزِ عمل شمار ہو گی۔ قران پاک میں علم (Knowledge) اور حکمت و ہدایت (Guidence) کو بالترتیب مادے اور روح کی جان پہچان کے طور پر انسان کو ودعیت کیا گیا ہے۔ اوّل الذکر کو ''و علّم اٰدم الاسماء کلّھا''[۱۴] کی صورت اور مؤخر الذکر کو ''فا مّایا تینّکم مّنّی ھُدای فلا خوف علیھم و لا ھم یحزنون''[۱۵] کے الفاظ میں بہ خوبی نشانِ خاطر رکھا جا سکتا ہے۔ ایک ارزش میں خودی کے عرفان کی منہج ہے تو دوسری میں بے خودی یعنی اجتماعی نشوو ارتقا کا سامان۔ علم کی غرض و غایت معرفتِ حق ہے۔ اغراض بدلے تو علم جہل سے جا واصل ہوا۔ ''اک نظر باشعور یعنی نورِ بصیرت سے مستنیر ہے اور دوسری بے شعور یعنی جوہر کی حقیقت سے بے خبر محض نگہِ غلط انداز۔ اسی تقسیم کے تناظر میں جاننے والوں اور نہ جاننے والوں میں خطّ امتیاز کھینچا گیا تھا۔ غور

کیا جائے تو تہذیب و تمدن کے ہر ارتقائی قدم پر یہی طریقت اسلامیوں کی رہی ہے کہ اس دینِ فطرت کے پیروکار ہیں جسے اس کے شارع ﷺ نے "اَلدِّینُ النَّصِیحَۃُ" کہا ہے۔[۱۶] واضح رہے کہ شریعت کے معنی ہی رواں دواں پانی کے گھاٹ یا آبی سُوتے کے ہیں[۱۷] جس کا پانی نڈھال ہو کر رک رہے تو چشمہ شریعہ کے بجائے کریہہ بن جاتا ہے۔ یہ طرزِ عمل ایک حرکی حکمتِ کار ہے اور بقائے حیات کا ضامن بھی۔ قرآن و حدیث سے استنباط کرتے ہوئے مسلم مفکرین نے حرمت و حلت کے ذیل میں ایک عمومی قاعدہ ذیل کے دو الگ الگ حوالوں سے وضح کیا ہے:

من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد[۱۸]

الأصل في الأشياء الإباحة حتى يدل الدليل على التحريم[۱۹]

تبدیلی کا عمل کائنات کی سب سے بڑی سچائیوں میں سے ہے اور جو حیاتیاتی پیکر فطرت کی اس تغیراتی خاصیت سے مطابقت پزیری میں غفلت یا سستی کا مظاہرہ کرتا ہے، ارتقائی ثمرات سے محروم کر دیا جاتا ہے اور تاریخ میں ایسی محرومیاں بڑے بڑے ڈائنوسارس کو بھی فوسلز میں بدل دینے پر منتج ہوئی ہیں۔ اس کے مقابل مادے کی فعالی صورتوں کو قبولنے یعنی سائنسی اور تکنیکی ترقیوں میں بھرپور حصہ لینے سے نشوارتقا کی اگلی منزلوں تک رسائی کی قابلیت نصیب ہوتی ہے۔ ہنری برگساں سماجی تبدیلیوں کی ارتقائی نوعیت کے ضمن میں رقم طراز ہے:

"To exist is to change,to change is to mature,to mature is to go on creating oneself endlessly."[20]

پس یہ بات توطے ہے کہ فی زمانہ کاروانِ ہستی سے ہم قدم رہنے کے لیے ورچوئل تعاملات سے صحت مندانہ ربط ضبط بنانا شرط ہے۔ آج کسی بھی ملک کی سلامتی، استحکام اور نمو یافتگی کا اندازہ اس کی دفاعی اور جارحیتی صلاحیتوں سے زیادہ آن لائن معاشی سرگرمیوں اور کمیونیکیشن ٹیکنالوجی کی استعدادِ کار سے لگایا جاتا ہے۔[۲۱] اپنے سماجی، ثقافتی اور اقتصادی امور کی برقیائی تحصیل و ترسیل سے متعلق معیاری شعریات ترتیب دینے اور ضابطۂ عمل وضع کرنے میں غفلت یا سستی دکھانے والی اقوام و ملل بتدریج اپنی ثقافتی نسل کشی (Cultural Genocide) سے دوچار ہو کر تاریخِ عالم کے حاشیے میں پناہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ پس چاہیے یہ کہ ہم اس سحر کار دنیا کی مضرت رساں مگر ناقابلِ تردید (Irresistable) دلچسپیوں اور ترغیبات سے بچنے کے لیے نظری اور اطلاقی طور پر کوئی قابلِ عمل حفاظتی حکمتِ عملی عوام الناس کے سامنے پیش کریں۔ ن۔ م راشد کے "

وزیرِ چنیں ''کو تو آمرانہ بیانیوں کی فکری آلودگی سے نجات کے لیے شیراز کے نائی کی سوجھ ہی گئی تھی(۲۲) مگر مادیت مرکوز چند حلقوں میں بٹتی ہوئی جدید دنیا کے غیر اعلانیہ اس نئے ورلڈ آرڈر اور اس کے منہ زور عالمی مکڑ جال کی استحصالی کارفرمائی سے رستگاری کا اُپائے کرنے والا شہ سوار ابھی دور کی گردِ راہ میں بھی سجھائی نہیں دے رہا۔

انیسویں صدی کا دورانیہ مختلف عالمی تہذیبوں کے ادغام و اتصال کے حوالے سے بہت نمایاں رہا ہے۔ عالمِ پیر روبہ زوال ہوا اور تہذیبِ مغرب کی کوکھ سے ایک جہانِ نو کے آثار ہویدا ہو چلے۔ اس صدی کا مقتدر استعارہ اگر اسٹیم انجن تھا تو بیسویں صدی نے اسے کمپیوٹر سے بدل دیا۔ اب اکیسویں صدی نے سوشل میڈیا کی صورت ورچوئل حقائق پر مشتمل ایک الگ ہی دنیا تخلیق کر ڈالی ہے۔ انسانی معاشرہ رنگ و نسل اور زبان و ایقان کی حصار بندیوں سے نکل کر تہذیبی، سیاسی، معاشی اور انتظامی منطقوں میں پناہیں تراش رہا ہے۔ میڈیائی وساطت سے اگر ایک طرف مغربی طرز کی لبرل جمہوریت پر مبنی ہیئتِ حاکمہ مثالی حکومتی نظام قرار پا رہی ہے تو دوسری طرف ہالی ووڈ فلموں کا پروردہ کلچر لطیف نفسیاتی حربوں کی وساطت سے دنیا کے طول و عرض کو متاثر کرتا آیا ہے۔ آج بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے مصنوعات کی پیداوار کو بڑھا کر اور نتیجتاً اس پر اٹھنے والے اخراجات کی اوسط مقدار کم کر کے ترقی پزیر ممالک کی صنعت و حرفت کا دیوالیہ نکال دیا ہے اور میڈیائی پراپیگنڈا اس مصنوعاتی افراط کی کھپت کے لیے مصنوعی ضروریات کا شعور اجاگر کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ گلوبل ویلج نئی محلہ سازی کے تحت مخصوص ترجیحات کی حصار بند آبادیوں (Gated-Communities) میں تبدیل ہوا جاتا ہے جس میں مکسلے کی تخیلی سماجی فعالیتیں پوری طرح فعال نظر آتی ہیں۔ سٹاک ہوم سنڈروم کا عارضہ ایک آفاقی قدرِ اشتراک ہو چلا ہے۔ مکسلے نے جو بات صیغہ واحد مذکر غائب کی مخاطبت میں مسطور کی ہے، ہم سب پہ انطباق کا جواز بنائے جاتی ہے:

"He had won the victory over himself. He loved Big Brother."(23)

کسی بھی جدید تر افادہ پرست گروہ کا مجموعی بیانیہ ایک پیکج کی صورت قبول نہ کرنے کی پاداش میں تنہائی مقدر ٹھہرتی ہے۔ فیض کی تخلیقی فکر ''ہم اہلِ صفا مردودِ حرم'' اس تناظر میں گنگنائیے تو معنی کا چراغاں ہوتا ہے۔(۲۴) اگرچہ اس منظر نامے کو انسانی سماج کی جدلیاتی حرکیات کا فطری وقوعہ بنا کر پیش کیا گیا ہے مگر مابعد جدیدیت کے بیشتر ناقدین اسے تشکیلی اور ساختیہ ہی خیال کرتے ہے۔ سوشل میڈیائی سماج سمعی علوم کی بجائے بصری علوم و فنون پر اپنی توجہ مرتکز کیے ہوئے ہے۔ لہٰذا ہماری دانش گاہوں، تحقیقی اداروں اور ممبر و محراب پر براجمان ہستیوں کو مزاجِ خانقاہی ترک کر کے رسمِ شبیری زندہ کرتے ہوئے اپنے فرائضِ منصبی کی بجاآوری کے طور پر ''بصائر'' کے جیسی منضبط سرگرمیوں کی عملاً حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اگر ہم سائبر دنیا کے علمیاتی تعامل میں شامل ہوئے بغیر

اس کی صارفی لَت میں پڑے رہے۔۔۔ جیسا کہ پڑے ہیں۔۔۔ تو یہ ٹیکنالوجی ہمارے فکر و عمل کی بدھیا بٹھائے بن ٹلنے کی نہیں۔ ہاں اگر ہم اس تکنیکی علم کی تخلیق کاری میں خود بھی شمولیت کرتے اور اس کی کثیر الجہتی حرکیات کو ضروری ترمیم و تحدید سے گزار کر انھیں اپنے ملی تشخص سے ہم آہنگ بنائے جاتے ہیں تو اس سے بڑھ کر قومی خدمت بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ جو سماجی طبقہ اس جدید مواصلاتی سر گرمی سے عاملانہ تعلق بنانے میں سستی دکھائے گا اس میں مطلوبہ اقداری مطابقت نہ بن پانے کے سبب یہ انقلاب آفریں ٹیکنالوجی معکوسی عمل ضرور دکھاتی ہے جس سے قوموں کا شناختی تشخص دھندلانے لگتا ہے۔

یادش بخیر! ایسی پیغمبری اُفتاد آپڑنے کو مولانا حالی نے ''وقتِ دعا'' قرار دے کے مابعد الطبعیاتی ذرائع سے استغاثہ کی راہ سدھائی تھی، اور دعائے مسنون کی شعریات حالیؔ کے شاگردِ معنوی یعنی علامہ اقبال نے بخوبی آئینہ کر دی ہیں: ''در دعائے نصرت آمیں تیغِ اُو''(۲۵) یعنی عملی جد و جہد دعا کا لازمہ ہے۔

ضعفِ بصر سے نہیں، ضعفِ بصیرت سے بدھیا بیٹھتی ہے ورنہ جاننا چاہیے کہ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری از منۂ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ فانوس کے حصار میں روشن شمع کو پھونکوں سے کوئی لرزش نہیں ہوتی۔ کعبے کو صنم خانوں سے پاسباں میسر آتے بھی چشمِ فلک نے کئی بار دیکھے ہیں۔ آرویل اور بکسلے کے مذکورہ ناولوں میں ظلم و تشدد اور ترغیب و تحریص کی پالیسیاں ریاستی ضمیر سے ہم آہنگ اوبرین اور مصطفی مانڈ جیسے کردار ہی پیدا نہیں کرتیں بلکہ ونسٹن اور وحشی جان جیسی مزاحمی شخصیات کو بھی جنم دیتی ہیں جن کی کارگاہِ فکر میں تشکیک اور بغاوت کے عناصر ڈھلتے اور انھیں مزاحمت کاری پر اکساتے ہیں۔ یہ ایک الگ وقوعہ ہے کہ ادارہ جاتی ہیئت حاکمہ انھیں بے بس کیے دیتی ہے۔ لہذا ''بریو نیو ورلڈ''، 'وَن فلیو اوور اینڈ ککوز نیسٹ'' اور ''ڈارک نیس ایٹ نون''، وغیرہ جیسے تخلیقی شہ پاروں میں ایسی مزاحمتی قوت بالترتیب خودکشی، قتل اور سزائے موت سے دوچار کر دی جاتی ہے تو ایسے کئی دیگر ناولوں اور ڈراموں میں ریاستی بیانیوں سے الگ سوچ کی سزا معاشی پابندیوں، خود سپردگی پر منتج ہوتی پسپائیوں اور انتشارِ آدرش کی صورت ذات کے بحرانوں یا لغو کیفیتوں کی شکل میں دکھا کر عبرت کے سامان کیے گئے ہیں۔ یہاں معروف دانش ور دیویندر اسّر کی یہ بات قابلِ حوالہ ہے کہ:

> ''ادارہ بندی میں غیر مہذب انسان کی نجات اگر پاگل پن اور خودکشی میں ہے تو پارٹی ممبر کی نجات مکمل خود سپردگی میں ہے۔''(۲۶)

سوچنا چاہیے کہ آیا یہ ''ناکام'' کردار منصوبہ بند ریاستی بیانیوں سے عدم اتفاق کی صورت بے ثمر گردانے جائیں گے؛ حاشا و کلّا۔ کبھی کبھی آدرش کی شیریں کو حاصل کرنے کے لیے فرہاد دوراں ''ضربِ کلیمی

''کے بجائے ''حکمتِ سقراطی'' بروئے کار لانا مناسب جانتا ہے۔ دراصل سوشل میڈیا اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دیگر مروجہ ذرائع کی مدد سے نئی استعماریت کے تانے بانے بنتے ہوئے ایک منصوبہ بند صورتِ حال کی عکس بندی کر کے مخصوص تشکیلی حقیقتیں متعارف کروائی جاتی ہیں۔ آج اگر امریکہ، اسرائیل، فرانس اور برطانیہ جیسے استعماری ممالک ایک تشکیلی وجود کے حامل ہیں تو دوسری طرف عراق، افغانستان اور ایران جیسی مستعمرہ مملکتوں کا شناختی تشخص بھی وہ نہیں جو سمع و بصر سے تعاملات کرتے برقی ذرائع پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> ''انفرمیشن ٹیکنالوجی کی قبا میں مغربی تہذیب کا دیو استبداد چھپا ہوا ہے۔ یہ باقی دنیا پر ہر ثقافتی غلبے کے حصول کا ایک نیا حربہ ہے اور اگر اس کی رفتارِ ترقی پر روک نہیں لگائی گئی تو تخلیقی وجدان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔''(۲۷)

ادبی تنقید کے تاریخی دبستان کا بانی طین تونسل، لمحہ اور ماحول کا سہ ابعادی تنقیدی پیمانہ دے کر تخلیق کار کی اُپج اور تخلیقی شخصیت کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا، جو محلِ نظر بات ہے۔ محبت میں جنوں آثاری نہ ہو تو نری مصلحت کوشی ہے، یونہی تخلیق ترجمانی محض نہیں ہوتی بلکہ تخلیقی سچائی خارج کو باطن سے تقلیب دیے سے حاصل ہوتی ہے۔ مارکس اور اینگلز کے انتقادی معیاروں کے مطابق روحِ عصر کو اپنے بطن میں سموئے مذکورہ ناولوں میں کمال کا ترفع (Sublimity) در آیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عہدِ رواں کی ورچوئل دنیا نے عشق نبرد پیشہ کو ایک نئے عرصۂ امتحان میں ضرور لا کھڑا کیا ہے مگر اس مجرد فرہاد کی منزل تو اب بھی وصلِ شیریں ہی ٹھہرے گی۔ شرطِ وصال بھی وہی جوئے شیر لانا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب کارگاہِ عمل یعنی کوہِ بے ستوں ایک وسیع اور پیچدار مکڑ جال کی صورت اپنے سنگین وجود کو گرانڈیل ترکیبے ہوئے ہے اور جوئے شیر اس سلسلہ ہائے علم و دانش میں موجود مِس انفرمیشن اور غیر متعلقہ مواد کے بھُس سے مطلوبہ معلومات کی سوئی تلاشنا ہے۔ خسرو کی قائم مقام یہاں نوع بہ نوع بیانیوں اور خدشات و ترغیبات کی شدت ہے کہ حصولِ مقصد کی راہ کا روڑا بنتی ہے؛ جب کہ ماؤس یا کرسر کی صورت جدید تیشے شرر فشانیوں کے لیے اپنے اپنے فرہادوں کی راہ تکتے ہیں۔ مکتبِ عشق کے ایسے تازہ نصابِ جنوں کا آموختہ کرتے کسی نووارد مجنوں کا متحیّر پیکر تراشتے ہوئے ڈاکٹر طارق ہاشمی کا موقلم یوں نیرنگیاں دکھاتا ہے:

جانے کس دریچے میں عکسِ یار تھا محفوظ
ہاتھ رکھ کے بیٹھا ہوں حافظے کے Mouse پر(۲۸)

بلاشبہ یہ ایک غیر روایتی صورت حال ہے اور تقاضا کرتی ہے کہ اسے غیر معمولی حکمت عملی سے نبھایا جائے۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ وہ پُر حکمت الوہی کتاب جو رہبرِ دوعالم ﷺ نے ایسی گنجلک مہموں (Complicated Challenges) کی عقدہ کشائی اور ان کے حسبِ حال صائب طرزِ عمل اختیار کرنے کے حوالے سے ہمیں عطا فرمائی تھی، کھولی جائے۔ یہ مبارک کتاب ہمیں خدا، کائنات اور انسان کے سہ ابعادی تعاملات کا ہر میکانزم کھول کھول کر سمجھاتی اور انسانی آنکھوں کے سامنے روبہ عمل وقوعوں کی مدد سے اس کی مثالیں پیش کرتی ہے۔ یہاں عطا کردہ ضابطۂ حیات میں سوشل میڈیا ہی کیا اس نوع کے کسی بھی فتنۂ آخر زماں کی امکانی صورتوں کے ضرر رساں لوازمات سے بچنے کے لیے ''تقویٰ'' کو حفاظتی اقدام قرار دیا گیا ہے جو اس نظریے کو دل و جان سے قبول کرنے کا بہترین ثمرہ اور خدا کے ہاں اکرامِ آدمیت کا معیار ہے۔[29] زمانۂ جاہلیت میں ''کریم'' کا لفظ اعلیٰ حسب نسب والے فیاض طبع انسان کے لیے مخصوص تھا۔ ہمارے ہاں بالعموم تقویٰ کا ترجمہ ''خوفِ خدا'' یا ''پرہیز گاری'' کیا جاتا ہے اور یوں اس بلیغ مشار کے بہت سے مرادی منطقے نایافت و نارسائی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ اگر ہم اس لفظ کے دیگر قرآنی استعمالات و مشتقات کو مد نظر رکھ کر معنویاتی تجزیے کی کوشش کریں تو اس کا مفہوم نظریۂ اسلام کے شعور و عرفان سے مستنیر ہو کر اپنی زندگی کے بارے میں اس عرفان کی مقتضی سنجیدگی روبہ عمل لانے سے عبارت ہے۔[30] تقویٰ ایک نپا تلا (سنجیدن بمعنی تولنا) مثبت رویہ ہے جس کے مقابل لفظ ''فجور'' ایک غیر ذمہ دارانہ فکر و عمل پر مشتمل سرگرمی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے: فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔[31] یعنی نفسِ انسانی میں صائب اور ناروا منہاج کا شعور قدرت کی طرف سے ارزاں کیا گیا ہے۔ راستکاری میں کامیابی اور کج روی میں بربادیوں کا سامان۔ یہی سکہ رائج الوقت ہے؛ دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم۔

عہدِ رواں کا فکری منظر نامہ شاہد ہے کہ انسان نے اپنے مابعد الطبعیاتی ایقان سے بے نیازی کبھی قبول نہیں کی۔ فی زمانہ دنیا تہذیبی اور ثقافتی طور پر ماڈرنائز تو ہو رہی ہے مگر ماڈرنیٹی کی تثلیثی مقتضیات یعنی انسان مرکزیت (Humanism)، اندھی عقلیت پرستی (Rationalism) اور فکری بے مہاری (Freedom of Thought) سے گریز پا بھی ہے کہ یہ سبق اسے دو عالم گیر جنگیں بھگتانے کی صورت بعد از خرابیٔ بسیار ملا ہے۔ معروف مغربی دانش ور محمد مارماڈیوک پکتھال نے اس ایقان کی تہذیبی اہمیت واضح کرتے ہوئے جدید دنیا کے الحادی فکر و فلسفہ کی سطحیت یوں آشکار کی ہے:

> "Modern western civilization is not a civilization, it is a savegry and I know this because I was a savege before.Civilisation cannot be produced by a system of thought without a belief in hereafter."(32)

پس سوشل میڈیا کے جدید تکنیکی لینڈ سکیپ کے حسبِ حال اپنے ہاں جدّتِ کردار لانے کے لیے ہمیں اسی کتابِ زندہ میں غوطہ زن ہونے کی ضرورت ہے۔ اسلامی طرزِ حیات اس ورچوئل سماج کے نفسیاتی چیلنجز سے صحت مندانہ انداز میں نپٹنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ مذہبی اقدار کی تعیینِ وقت ہمیں نیٹ پہ جمے بیٹھے سکرولنگ کی لَت (Scrolling addiction) میں مبتلا ہونے سے بچاتی ہے۔ ہر روز بارگاہِ الٰہی میں کھڑے ہو کر صراطِ مستقیم سدھانے کی التجا کرنا اور روشِ گمرہاں سے بچاؤ کے لیے توفیقِ عمل مانگنا معرکۂ خیر شر کے ہر میدان میں عجز پیشہ انسان کے لیے مابعد الطبعیاتی قویٰ کی ارزانی کا باعث بنتا ہے۔ مکتبِ عشق میں نفی اثبات کا سبق لینے والی ملت کا ہر فرد محض اسی توفیق کے سبب آتشِ نمرود کی تپش اور بحرِ ظلمات کی غرقابیوں سے محفوظ و مامون ٹھہرتا ہے۔ تہذیبِ عشق اسے آدابِ وفا کی پاس داریاں کرنے اور نفسِ امّارہ کی ہر ترغیب و تحریص سے گریز پا رہنے کا شعور دیتی ہے۔ ہمارے نبی ﷺ معلم مبعوث کیے گئے ہیں جن کے فلسفۂ تعلیم و تدریس میں متعلمین کے نفسیاتی تقاضوں کے پیشِ نظر تدریسی سرگرمی میں توازن و تناسب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ تبلیغِ دین میں ''حریص'' ہونے کے باوصف آپ ﷺ کے ہاں باجماعت دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں کو رات کے اوقات میں جاری رکھنے کی شاید ہی کوئی مثال ملتی ہو۔ آج سوشل میڈیا کی پیش کردہ علمی منڈی (Knowledge Market) کے لامحدود معلوماتی ذخیروں سے اخذ و استفادہ کی صائب منہج اختیار کرنے میں اسوۂ حسنہ سے بھرپور رہنمائی لی جا سکتی ہے۔ حکومتی سربراہی میں ٹیکنالوجی کے ماہرین ایسی حکمتِ عملی ترتیب دیں کہ غیر مطلوبہ مواد سے اجتناب کی آسان سبیل ہاتھ آسکے۔ مخرب الاخلاق ویب سائٹس پر سختی سے پابندی رہنی چاہیے۔ خاص طور پر ہمیں نسلِ نو کی تربیت اس منہج پر کرنی ہے کہ پُر فتن چیلنج سے سرخروئی کو یقینی بنا سکیں اور اس کے لیے بھرپور سوشل میڈیا ایمرجنسی کارروبہ عمل آنا وقت کا تقاضا ہے۔ فی زمانہ حسرتِ مواد کے بجائے کثرتِ مواد ارمانِ وصل کا خون کیے جاتی ہے۔ اس مرض کا چارہ مسیحائے آخر الزماں ﷺ نے قرانِ حکیم کی صورت ہمیں ارزاں کر رکھا ہے۔ اسی نسخے میں، اور صرف اسی نسخے میں سامانِ مسیحائی ہے۔ یادش بخیر، اتفاقاتِ زمانہ کے شناور میر تقی میرؔ نے فتنۂ باطنی سے نبرد آزمائی کی حکمت یوں شعریائی تھی:

مژگانِ تر کو یار کے چہرے پہ کھول میرؔ
اس آب خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے(۳۳)

علم و حکمت کا حصول تقاضائے بشریت ہے مگر ایسے الوہی خزینوں کا مادیت پرستانہ استعمال ان کی افادیت پر سوالیہ نشانات کھڑے کر دیتا ہے۔ جدید استعماری بندوبست اپنے انتدابی حلقۂ اثر کی جملہ اشیا اور فکری نظری اقدار کو جلبِ منفعت کی غرض سے محض ایک کموڈٹی خیال کرتے ہوئے جنسِ بازار بنائے جاتا ہے۔ یہاں نو آبادیاتی نظامِ کار کی منہج پر رہتے ہوئے زیر دست اقوام کی تہذیبی و ثقافتی شناخت مٹانے یا تغیر آشنا کرنے جیسے روایتی داعیے کے بجائے زیادہ دلچسپی ایسی اقدار و رسوم میں مخصوص جدت و نُدرت متعارف کروا کر اپنے فوری مفادات کو یقینی بنانے میں لی جاتی ہے۔ اس ضمن میں علی اصغر عباس کی نظم ''روشنی کی تجارت'' کا یہ اقتباس چبا چبا کر پڑھنے کے قابل ہے:

''روشنی کی تجارت
سفیرانِ شب کو بہت راس آئی
ستاروں کی قیمت میں جگنو خریدے
انھیں چاند سورج کا لیبل لگا کے
شہابوں کے نرخوں پہ بیچا''(۳۴)

ایسے پُر فتن عہد میں صائب ترین طرزِ عمل کو نبی اکرم ﷺ نے خار دار جھاڑیوں بھرے جنگل سے اپنا لباس بچا بچا کر گزران کرتے مسافر کے محاکاتی تمثال میں عکس بند کیا ہے۔ ایسے راہرو کے دل میں دبی گلِ مراد کی خواہش اس کے ذوقِ سفر کو خلشِ خار سے خائف نہیں ہونے دیتی۔ ایسے بیم و رجا کے ماحول میں کامگار رہنے کا داعیہ روایت اور جدّت سے بیک وقت انسلاک کا متقاضی ہے جس کے معجزاتی سنگھم کا استنباط ''مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ'' کی آیۂ مبارکہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔(۳۵) اسی سنگھم کے پاک پتن سے حاصل کردہ آبِ حیات (سوم رَس) سے انسانیت کے مرضِ کہن کا چارہ ہو سکتا ہے۔ شبلی نعمانی اس ضمن میں رقم طراز ہیں: ''ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے:

در کفے جامِ شریعت ، در کفے سندانِ عشق
ہر ہوس ناکے نہ داند جام و سنداں باختن''(۳۶)

ایسے تمام حیات آفریں اقدامات اور ان کی تربیت کے قرینے علامہ اقبال نے قرآن حکیم سے ماخوذ اپنی مثنویوں ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' میں بڑی صراحت سے دہرائے ہیں جو بلا تفریق ہر انسان کے لیے یکساں مفید ہیں۔ ''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔'' ایک چینی مفکر نے حیاتِ انسانی کی شعریات سے متعلق حکمتِ چینیاں کے مفسر چانگ چاؤ کا پُر مغز (Pregnant) مقولہ نقل کیا ہے:

''جو لوگ اُن کاموں کو اہمیت نہیں دیتے جنھیں عام لوگ اہمیت
دیتے ہیں، صرف وہی لوگ اُن چیزوں کو اہمیت دے سکتے ہیں
جنھیں عام لوگ اہمیت نہیں دیتے۔''(۳۷)

صدیوں پرانے اس جملے کو چینی قرأت کاروں کی باعمل قرأت نے زندہ کیا تو یہ گراں خواب قوم آج اقوامِ عالم کی ''امامت'' کا منصب سنبھال رہی ہے۔ 'گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا'۔ ادھر ہم، کہ لاریب آیتوں کے امین تھے مگر قرأت کا سلیقہ گم کیے بیٹھے ہیں۔ یاللعجب!

حواشی و حوالہ جات

(۱) کویم کروما (Kwame Nkrumah): Neo-Clonialisn,The last Stage of Imperialism (نیویارک: انٹرنیشنل پبلشرز کمپنی، ۱۹۶۶ء)، ص (xi)

(۲) حامد علی خاں (مرتب): دیوانِ غالب (لاہور: الفیصل، ۱۹۹۵ء) ص ۱۱۷

(۳) رشید حسن خاں: گنج ہائے گراں مایہ (لاہور: اردو اکیڈمی، طبع دوم، ۱۹۴۴ء)، ص ۱۴۰

(۴) جارج آرویل: ۱۸۸۴ء (لندن: سیکر اینڈ وار برگ، ۱۹۴۹ء)

(۵) کویم کروما (Kwame Nkrumah): Neo-Clonialisn,The last Stage of Imperialism، ص ۹

(۶) شرر، عبدالحلیم: فردوسِ بریں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، س ن) ص ۴۷

(۷) ہکسلے، آلڈس: Brave New World، (لندن: پینگوئن بکس، ۱۹۶۳ء)، ص ۱۷

(۸) ''رس'' کے لفظی معنی لذت کے ہیں جب کہ سوم ایک نشہ آور رس دینے والے درخت کا نام ہے۔ ہندوی روایات کی رو سے سوم رَس سے مراد ایسی شراب جس کا پینا داخلِ عبادت خیال کیا جاتا ہے۔ [ر۔ک: اردو لغت (تاریخی اصول پر) کراچی، اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۱ء، ص ۱۹۱]

(۹) دیویندر اسّر: دیوہیکل ادارے اور ذات کا بحران، مشمولہ: شب خون، الہ آباد، جلد ۲، ش ۲۰، ۱۹۶۸ء، ص ۸

(۱۰) تحسین فرقی، ڈاکٹر، جستجو (لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۴

(۱۱) غلام عباس: دھنک، مرتبہ: سجاد کامران (کراچی ۷:۶۔ایچ، بلاک ۶، پی ای سی، ہاؤسنگ سوسائٹی، ۱۹۶۹ء)، ص ۳۷

(۱۲) دیوندر ستیارتھی: ستلج پھر بپھرا، مشمولہ، اور بنسری بجتی رہی (لاہور: انڈین اکیڈمی، ۱۹۴۶ء) ص ۱۲

(۱۳) کوہن، برنارڈ ایس: Colonialism and its forms of knowledge (امریکہ: پرنسٹن یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۶

(۱۴) ترجمہ: ''اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے''۔ (القران، سورۃ: البقرۃ، آیت: ۳۱)

(۱۵) ترجمہ: ''جب تمھارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو (اس کی پیروی کرنا کہ) جنھوں نے میری طرف سے ہدایت کی پیروی کی تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے''۔ (القران، سورۃ: البقرۃ، آیت: ۳۸)

(۱۶) ترجمہ: ''دین خیر خواہی (کا نام) ہے۔'' (غلام رسول سعیدی: شرح صحیح مسلم، باب نمبر ۲۲ (لاہور: فرید بکسٹال، ۲۰۰۲ء)، ص ۴۷۲

(۱۷) سجاد میر ٹھی، زین العابدین (مرتب): بیان اللسان (عربی اردو ڈکشنری) (کراچی: دار الاشارت، ۱۹۷۴ء)، ص ۳۹۷

(۱۸) ترجمہ حدیث: ''کہ جس نے ہمارے دین کے کسی معاملہ میں کوئی نئی چیز متعارف کرائی وہ مردود ہے۔'' (محمد فواد، عبدالباقی (مرتب): المسند الصحیح المختصر بنقل العدل عن العدل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بیروت: دار الاحیا التراث العربی، حدیث نمبر: ۱۷۱۸)

(۱۹) اس عمومی اصول کا ترجمہ یہ ہے: جمہور (یہاں اس سے مراد امام ابو حنیفہ کے علاوہ باقی علماء) کے نزدیک اشیاء میں اصل مباح ہونا ہے یہاں تک کہ اس کے حرام ہونے کی کوئی دلیل آجائے۔

(۲۰) ہنری برگساں: Creative Evolution، مترجم، آرتھر ملر (لندن، میکمیلن اینڈ کمپنی، ۱۹۶۴ء)، ص ۸

(۲۱) محمود شام: آیئے آن لائن سماج کی تیاری کریں (کالم)، مشمولہ: روزنامہ جنگ، ۷/جون ۲۰۲۰ء

(۲۲) راشد، ن۔م: کلیاتِ راشد (دہلی ۶، کتابی دنیا، ۲۰۱۱ء)، ص ۲۳۹

(۲۳) ہکسلے، آلڈس: Brave New World (لندن: پینگوئن بکس، ۱۹۶۳ء)، ص ۱۷

(۲۴) اس نظم کا عنوان: ''وَ یَبقیٰ وَجہُ رَبِّک'' ہے۔ پاک و ہند کی معاصر مزاحمتی تحریکوں میں بے حد مقبول رہی کیوں کہ اس میں پرولتاری طبقے کے منشوراتی نکات بڑی جامعیت سے شعر یائے گئے ہیں۔ [ر۔ک: فیض احمد فیض: نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبہ کارواں،، س ن، ص ۶۵۷]

(۲۵) اسرارِ خودی کے اس مصرعے میں دعائے مسنون کا یہ سبق پوشیدہ ہے کہ اسے بارگاہِ ایزدی میں بھیجتے ہوئے عمل کا زادِ راہ فراہم کیا جائے تو اجابت برائے استقبال آتی ہے، یعنی عمل دعا کا لازمہ ہے۔ (اقبال، علامہ: کلیات اقبال (فارسی)، لاہور: مکتبہ دانیال، س ن، ص ۴۳)

(۲۶) دیویندر اسّر: دیو ہیکل ادارے اور ذات کا بحران، ص ۷

(۲۷) شمیم حنفی: اردو ادب کی موجودہ صورت حال، مشمولہ: شعر و حکمت، حیدر آباد (بھارت)، مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۲۸

(۲۸) طارق ہاشمی،ڈاکٹر:دستک دیا دل(فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۰ء)ص ۷۲

(۲۹) متعلقہ فرمان یہ ہے:''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہ اَتْقٰکُمْ'' جس کا ترجمہ محمد مارماڈیوک پکتھال نے اسلامی طرزِ عمل کے حوالے سے یوں کیا ہے:

"Lo the noblest of you in the sight of Allah is the best in conduct."

(القرآن، مترجم: محمد مارماڈیوک پکتھال،، لاہور: پاک کمپنی، سورۃ الحجرات، آیت ۱۳)

(۳۰) توشی ازتسو:دینی اخلاقیات کے قرآنی مفاہیم،مترجم:ڈاکٹر خالد مسعود(لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ،۲۰۰۵ء)،ص۱۱۸

(۳۱) ترجمہ:''پس اس کی بد کاری اور پرہیز گاری دل میں ڈالی''(القرآن، مترجم:احمد رضا خان (لاہور: ضیاء القرآن، سورۃ:الشمس،آیت۸)

(۳۲) پکتھال، محمد مارماڈیوک، مشمولہ:نظریات(اسلام آداد، جلد اوّل، ش ۴، ستمبر ۲۰۱۳ء)، ص ۶۷

(۳۳) ظلِّ عباس عباسی(مرتب)، کلیاتِ میرؔ(جلد اوّل) ،(نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، طبع سوم،۲۰۱۳ء)ص ۶۵۸

(۳۴) عباس، علی اصغر، روشنی کی تجارت، مشمولہ:استعارہ، شمارہ:۱،(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۷ء)، ص ۶۹

(۳۵) ترجمہ:''اس نے دو سمندر(شیریں اور شور) بہائے کہ دیکھنے میں معلوم ہوں ملے ہوئے۔''(القرآن، پارہ ۲۷، آیت ۱۹)

(۳۶) شبلی نعمانی، سراج الدین محمد:مقالاتِ شبلی، مرتب:سید سلیمان ندوی، ج:۳(اسلام آباد:نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۵۸

(۳۷) لین یُوتانگ، جینے کی اہمیت، مترجم: مختار صدیقی(لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۶ء)، ص ۵۵۶

Bibliography

Alquran

Bargasan, Hunrey: Creative Evolution (London: Mecmelon & Co. 1964)

Davinder Satyarthi: Aor Bansari Bajti Rahi (Lahore: Indian Academy, 1946)

Faiz Ahmad Faiz: Nuskha Hay Wafa (Lahore: Maktaba Karwan)

George Orwell:1884(London: Sekor and Warburg,1949)

Ghulam Abbas (Edi): Dhanak (Karachi, No. 6/7, PEC Housing Colony, 1969)

Ghulam Rasool Saeedi: SharaH Saheeh Muslim (Lahore: Freed Bokk Stall, 2002)

Hamid Ali Khan (Edi): Dewan e Ghalib (Lahore: Alfaisal,1995)
Hukslay, Aldus: Brave New World (London: Panguin Books, 1963)
Iqbal, Allama: Kuyat e Iqbal (Farsi), (Lahore: Maktaba Danyal)
Khalid Masood, Dr (Tran): Ikhlaqiaat Kay Qurani Mafhoom (Lahore: Idara Siqaftay Islamia, 2005)
Kohan Barnard S: Colonialism and Its Forms of Knowledge (America: Prinstion University, 1996)
Kwame Nkrumah: Neo-Colonialism, The Last Stage of Imperialism (New York: Internatio Publishers Co. INC,1966)
Mukhtar Siddiq (Trans): Jeenay Ki Aahmeeat (Lahore: Maktaba Jadeed, 1956)
Rasheed Hasan Khan: Ghanj Haay Gran Maya (Lahore: Urdu Academy,1944)
Rashid N M: Kulyat e Rashad (Dehli 6: Kitabi Dunia 2011)
Sharar, Abdul Raheem: Fardos e Bareen (Lahore: San e Meel
Pulications, 1966)
Sjad Meerthi (Edi): Bian ul Lesan (Karachi: Darul Ishaat, 1974)
Suleman Nudvi Syed (Edi): Maqalat e Shiblee (Islamabad: National
Book Foundation, 1989)
Tariq Hashmi:Dastaq dia dil(Faisalabad:Misal Publishers,2010)
Tehseen Fraqi: Justaju (Lahore: Universal Books, 1987)
Zill e Abbas Abbasi (Edi): Kulyat e Meer Vol:1 (New Dehli: Qomi Konsil Bray Froog e Urdu Zaban,2013)